# اخلاقِ نبوّت سے اکتسابِ فیض کی

# شرط اور علامت

تحریر : پروفیسر حافظ احمد یارؒ

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۹۹)

سیرت نگارانِ رسول ﷺ میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ کی بعثت کے لئے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا؟ مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب 'ثورۃ **الاسلام وبطل الانبیاء**'' کا آغاز ہی اسی طرح کیا ہے:

''دنیا کی تاریخ' انسانی تمدن کی داستان اور قدیم وجدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے ہی قابل تو جیہہ واقعات اور پہیلی یا معمہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں سامنے آتی ہیں جنہیں پڑھ کر یا سن کر آدمی محوِ حیرت رہ جاتا ہے ـــــ اور اسی قسم کے ناقابلِ فہم معموں میں سے یہ چیستاں بھی ہے کہ آخر اللہ نے انوارِ نبوت و رسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لئے جزیرۃ العرب کو ہی کیوں منتخب کیا؟''۔(۱)

اور کچھ آگے چل کر اہل عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال دہرایا ہے:

''آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین کا سرچشمہ اور اس کا مرکز ومنبع بنانے کے لئے چن لیا؟''(۲)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں ''عربوں کی خصوصیات

---

(۱) ثورۃ الاسلام وبطل الانبیاء : لطفی' ص ۷

(۲) ثورۃ الاسلام وبطل الانبیاء : لطفی' ص ۳۸

اور خیر الامم بننے کی صلاحیت'' کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب سے بحث کی ہے۔ اس موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''نبی رحمت'' میں کی گئی ہے۔ جس کے ایک باب کا عنوان ہے: ''محمد رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟''۔

اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لئے اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف اسباب یا نکات گنوائے ہیں مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص خاص اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے' جس نے ان لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

☆ یہ سوال کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی تمام مہذب اور متمدن قوموں کو چھوڑ کر عرب کے ان گمنام نشینوں کو اس منصب عظیم کے لئے کیوں چن لیا؟ اگر یہی نبی ہندوؤں' بدھوں' یہودیوں یا چینیوں' ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک قوم میں مبعوث کر دیئے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے اور ویسا ہی انقلاب برپا نہ ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعے سے ہوا؟

☆ جو وقت کی ''بڑی طاقتیں'' (Super Powers) تھیں کیا ان میں سے کوئی بھی ''بہترین'' امت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی؟

بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں' اس لئے کہ مصالح کلیہ الٰہیہ کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسی لئے خود قرآن کریم نے اس مسئلہ پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام:۱۲۴)

''اور اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا یہ پیغام کہاں اور کس کے حوالے کیا جائے۔''

تاہم اس اندازِ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آ سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبی ﷺ سے انتساب اور اسلام کے نعرہ ہائے بے حد و حساب اور ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ کیا ہم کہیں عہدِ جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط قرار دیا جا سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کایا پلٹ دی وہ عجائباتِ تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلب ماہیت اور تاریخ عالم کے اس

سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہمہ گیری اور وسعت کو سمجھنے کے لئے سیرت نگار ظہورِ اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب کی خصوصاً دینی' معاشی' سماجی اور اخلاقی حالت بلکہ ان سب حالتوں کی ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے۔

عجمی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم وبیش سیرت یا تاریخ کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے' لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ کا تجزیہ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں کیا ہے کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور دَور کے رسم ورواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معناً یہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے' بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے۔ حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہبِ عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ ہائے معارف کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کا موقع ملا جن کا شاہ صاحبؒ کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرتِ انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل وتفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعیش پسندی' تن آسانی اور دنیوی لذائذ ومفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لئے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے (کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتسابِ فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں' خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیر الامم بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ہرگز ممکن نہیں ہوتا ـــــ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیتِ الٰہی نے ان اقوام کو اس منصبِ عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام رذائل وفضائل پر ایک نظر ڈالیں' جو فیضانِ نبوت کی بدولت بہترین امت بن گئے' تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی' ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر اسے ''شب ظلمت''، ''عرب کا تاریک دَور'' اور ''فسادِ بر و بحر'' وغیرہ عنوانات

کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام' سنگدلی و سفاکی' چوری اور رہزنی' قتل و غارت' بے حیائی و بدتمیزی' زنا و فواحش' نسبی تعصب و غرور' قمار بازی' شراب نوشی اور دختر کشی و سود خوری میں قریب قریب ضرب المثل تھے۔ اور ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معریٰ نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظام اخلاق کے بدترین اجزاء میں بھی اخلاقِ حسنہ کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی' فیاضی اور سخاوت کا مظہر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ اور قبائلی عصبیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت' پابندیٔ عہد' شجاعت' فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (بھلائی)' امانت' راست گوئی اور پاکدامنی کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے۔ اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے توقیر و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقِ حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی' حب جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزاء بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا—— مشہور حدیث ((خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا)) میں اس ''تحویل قبلہ اخلاق'' کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی خِيَارُكُمْ کی تفسیر ((خِيَارُكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا)) سے کی گئی ہے۔

دورِ جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے' اس کی ایک مثال تاریخ نے ''حلف الفضول'' کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اسی حلف میں (جس کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض خانوادوں کے نمائندوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم و بے انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مبصر یا خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے' ایک مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔

یہ حلف جسے سیرت نگار ''اکرم حلف واشرفہ سمع بہ فی العرب'' (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں' ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض ومقاصد یوں تھے:

''انہوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے اور ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کیے گئے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔''(۱)

کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرۂ نفاذ بہت محدود تھا' اس کا مقصد صرف حرم مکہ میں مظالم کی روک تھام تھا' اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا تاکہ حرم کی عزت وحرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ ہونے پائے' لیکن کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم ہے؟ چلئے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی ـــــ حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدہ کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا۔(۲)

آج یو این او اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں' اسے سامنے رکھیں تو حلف الفضول منعقد کرنے والوں کی اخلاقی قوت' ان کی فطرتِ سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الامم کے ہراول دستوں میں شمولیت کے شرف کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آقائے دو جہاں ﷺ خود بھی (بعمر بیس سال) عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدہ میں شامل ہوئے تھے۔ آپؐ اس معاہدہ سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپؐ نے اس کی تعریف وتحسین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس وخاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں' تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظت حق اور اعانت مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے کچھ نیچے ہی کے درجے پر ہیں۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن کثیر' جلد اول' ص ۲۵۹۔۶۲۱۔

اہل عرب کی مثال ایک ایسی زرخیز زمین کی تھی جو کاشت ونگہداشت کے نہ ہونے کے باعث خودرو خاردار جھاڑیوں کا جنگل بن گئی تھی۔ ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوت نمو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ ہادیٔ برحق نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو ترتیب دے کر مکارم اخلاق کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور حق دار ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ﴿وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا﴾ (الفتح:۲۶)

ہمارے اس موقف کہ نبوت سے اکتساب فیض کے لئے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں' کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متصف بھی۔

سب سے پہلے اُمّ المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ دیکھئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاکبازی کے باعث ''طاہرہ'' کے لقب سے مشہور تھیں۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

''وہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاکدامنی کے باعث طاہرہ کہہ کر پکاری جاتی تھیں''۔

حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت ﷺ کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپؐ کو گھر میں بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا:

''اے میرے چچازاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ آپ سے میری (برادری کی) رشتہ داری بھی ہے' آپ اپنی قوم میں صاحب عزت بھی ہیں' ان سب پر مستزاد آپ کی امانت' اخلاص اور راست گفتاری ہے''۔

پہلی وحی کے نزول اور بعثت کے ابتدائی ایام میں جو واقعات وحالات پیش آئے تھے ان کی بناء پر حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی:

''ہرگز نہیں' بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا' آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے ہیں' دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں' محتاجوں کے کام آتے ہیں' مہمان نواز ہیں اور راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں''۔

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے بارے میں سیرت نگار لکھتے ہیں کہ آپؓ ایک با اخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔ حضرت ابوبکر

صدیق ؓ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنہ کے بیان سے ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ابوبکر الصدیق ؓ بھی آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو ایک دن کے فاصلے پر انہیں ابن الدغنہ ملا۔ (اصل نام سعیہ بن رفیع تھا اور وہ اس وقت امابیش کا سردار تھا جو ایک مجموعہ قبائل تھا) اس نے پوچھا تم کہاں چلے؟ جب انہوں نے بتایا کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے بہت ہی اذیت پہنچائی ہے اور سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے' تو ابن الدغنہ نے کہا:

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بخدا آپ تو قبیلہ کے مایہ ناز فرزند ہیں' آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں' نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلئے میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔''

ہم ان مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں' ورنہ تمام ''سابقین اولین'' صحابہؓ میں قبل از اسلام ہی کسی نہ کسی خالص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ؐ کے محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپ ؐ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپ ؐ کے ''خلق عظیم'' ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم کو بھی معلوم ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے صاحب خلق عظیم ہونے کا تعلق آپ ﷺ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیاتِ نبوی ؐ کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (کہ آپ ؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلمہ امر ہے) کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مشہور حدیث ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ'' (کہ آپ ؐ کا اخلاق تو قرآن تھا) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاق کی تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ سورۃ القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے

کہ سورۃ القلم بلحاظ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دَور کی مکی سورت ہے اور یہ آیت مبارکہ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞﴾ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن پاک نے پیش کی۔ (اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۂ یونس اور سورۃ العنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)۔

قرآن حکیم کا آپ ﷺ کے خلق عظیم کو بطور دلیل پیش کرنے سے مدحیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں' ازاں جملہ:

اوّلاً یہ کہ ـــــ اہل مکہ (جو جاہلیت عرب کے رذائل وفضائل کے نمائندہ قرار دیئے جا سکتے ہیں) میں اتنی عموماً اخلاقی حس ضرور تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کئے جا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی سورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۴) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعہ رذائل ہو' چاہے وہ کتنا ہی صاحب جاہ و مال ہو' اسے ہیچ سمجھو۔ فرمایا:

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۞ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۞ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۞ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۞ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۞﴾ (القلم: ۱۰۔۱۴)

''ہرگز نہ دبو اُس شخص سے جو قسمیں کھانے والا' پست فطرت' طعنہ جو' چغل خور' مانع خیر' دھاندلی باز' بدعمل' جفا کار اور ساتھ ہی بداصل بھی ہے' محض اس بنا پر (چوہدری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال واولاد رکھتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین ''خلق عظیم'' اور ان آیات میں بیان کردہ ''رذائل تسعہ'' کے تغایر وتباین کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ ـــــ اس آیت ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞﴾ کے مضمون اور اس کے زمانہ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ قبل از بعثت ہی صاحب خلق عظیم تھے۔ محمد عزت دروزہ لکھتے ہیں:

''اور یہ خلق عظیم جس کی بنا پر آنحضور ﷺ اس ثنائے ربانی کے مستحق ٹھہرے' اس سے آپؐ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے' بلکہ اسی چیز نے آپؐ کو اس برگزیدگی اور اس منصب عظیم کا اہل بنا دیا تھا اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لئے کون اور کتنا موزوں ہے''۔

یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضور ﷺ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے

تدریجاً نمودار کیا ہے۔قرآن و سنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرت ﷺ کے خلق عظیم کے خدوخال کی مکمل تصویر کشی ہے۔اور اسی لئے آپؐ کی ذات گرامی کو اُمت کے لئے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا۔خود اسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ ـــــ اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوتِ محمدی (علیٰ صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی و نقلی دلائل کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔اس کے لئے عہد رسالت اور قرنِ اوّل کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضور ﷺ کے صرف دو معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ایک قرآن دوسرے اخلاق النبیؐ۔ابتدائے اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا یا نبی کریم ﷺ کا خلق عظیم دیکھ کر۔اہل مکہ خلق محمدیؐ کا مشاہدہ کر سکتے تھے ـــــ مابعد النبی ادوار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری امت پر ہے کہ ایک طرف اخلاقیاتِ نبویؐ سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر (حسب استطاعت) فرض عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیات نبویؐ کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

رابعاً یہ کہ ـــــ آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور مؤثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لئے، اس کے غلبہ کا دورِ ثانی لانے کے لئے اور فیوض و برکاتِ نبوت کو پھیلانے کے لئے صرف اور صرف گرمئ گفتار، پروپیگنڈا اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سیمینار نہیں بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ و تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہوگی۔اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحائے اُمت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ابتدا سے ہی صرف اخلاقی نظریاتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا اور توحید، رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسن اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمان کی ایک لازمی خصوصیت یا بالفاظ دیگر نبوت سے اکتساب فیض کی علامت قرار دیا۔یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہد رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرام ؓ کے کارنامہ ہائے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱) حضرت ابوذر غفاری ؓ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں۔انہوں نے

جب آنحضرت ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو دریافت احوال کے لئے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس جا کر آنحضور ﷺ کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی:

''وہ بھلائی کا حکم دیتا' برائیوں سے منع کرتا اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے''۔

یہاں اخلاق کے ضمن میں ''تعلیم'' یا ''تلقین'' یا ''تبلیغ'' وغیرہ کی بجائے ''امر'' کا لفظ قابل غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں قوتِ عمل سے ہے' یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی تربیت کا نام ہے۔

۲) ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاح عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا' بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے قابل غور ہیں:

> کہا: ''اے بادشاہ! ہم پروردۂ جاہلیت قوم تھے' بتوں کو پوجتے' مردار کھاتے اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے۔ رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور ہمسایوں کو دکھ دیتے تھے' اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کر کھا جاتا۔ پھر اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے خاندان' حسب و نسب اور جس کی سچائی' امانت اور پاکبازی سے ہم پہلے واقف تھے۔ انہوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور انہوں نے ہم کو سچ بولنے' امانت ادا کرنے' رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے' پڑوسی سے حسن سلوک کرنے' ناجائز اور حرام باتوں اور خونریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں' جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا۔ پس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی' جو انہوں نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانا اور جو انہوں نے حلال بنایا اس کو حلال تسلیم کیا''۔ (۱)

آنحضور ﷺ نے مکارمِ اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ آپ زمانۂ جاہلیت کے اصحابِ مکارم و محاسن کی قدردانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام

عبد اللہ بن جدعان (بانی حلف الفضول) کو آپ نے کتنی دفعہ تعریف بھرے الفاظ سے یاد فرمایا' حالانکہ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ جس آدمی نے (ایمان لا کر) زندگی میں ایک دفعہ بھی اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟

اس قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے' وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

''حضور! میرا باپ ہلاک ہو گیا اور فدیہ گزار نہ رہا۔ اگر یہ مناسب جانیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں۔ میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں' میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا' وہ نیک شہرت کا مالک تھا' مہمان نوازی کرتا تھا اور بھوکوں ننگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا اور اس نے کبھی کسی حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا' میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بچی! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہی تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے دعائے رحمت بھی مانگتے''۔ پھر حکم دیا: ''اسے رہا کر دیا جائے کیونکہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی مکارم اخلاق کو پسند فرماتا ہے''۔

یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہؓ بن نیار کھڑے ہوئے اور سوال کیا: ''یارسول اللہ ﷺ کیا مکارم اخلاق آپؐ کو (اس قدر) پسند ہیں؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے' کوئی ایک آدمی بھی جنت میں حسن عمل کے بغیر نہیں جائے گا''۔

جب بھی ہم مکارم اخلاق اور اخلاقیاتِ نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لئے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب ضروری ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثناء کا حقدار ٹھہرنا عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیر اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی ''اجتناب کبائر'' اور ''مسابقۃ الی الخیرات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (النساء: ۳۱)

''جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے

رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے قصور محو کر دیں گے اور تم کو مقامِ عزت پر جگہ دیں گے''۔

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸)

''اور ہر ایک (مقام) کا ایک مرکز توجہ (یا مطمحِ نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو''۔

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تربیت اور تکمیل کے لئے اس ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپؐ نے سب سے پہلے ان اصولی اور بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش موجود ہوتی ہے اور ایسے شخص میں نبوت سے اکتسابِ فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آتے ہیں جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ تھا۔ نبیؐ سے متعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام کو قبول کرنے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار کریں۔ اسلام لانے کے بعد' مسلمان کہلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہونا اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور ہے۔

بقول اقبال۔

آنکہ از صدق و امانت بے خبر روزِ تمہیدِ رسالت بے خبر
کارِ او گفتارِ بے کیفِ عمل او نیامِ علم بے سیفِ عمل
لذتِ ایماں فزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل!

''وہ جو کہ صدق و امانت سے بے خبر ہے گویا رسالت کی تمہید سے بے خبر ہے۔ اس کا کام عمل کے بغیر گفتار ہے اور اس کا علم عمل کی تلوار کے بغیر بے نیام ہے۔ ایمان کی لذت عمل میں آگے بڑھنا ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جس میں عمل نہ ہو''

نبوت سے اکتسابِ فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارمِ اخلاق ہیں جنہیں مقصود بعثت نبویؐ کہا گیا ہے۔

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) مَحَاسِنَ الْاَعْمَالِ))

''میں مکارم اخلاق کو یا محاسن اعمال کو مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔''

مگر مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچ سکنا فیض نبوت سے یکسر محرومی نہ سہی ''کم نصیبی'' کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے رموز بے خودی میں گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

آنکہ مہتاب از سرانگشتش دونیم
رحمت او عام و اخلاقش عظیم
از بہارش رنگ و بُو باید گرفت
بہرۂ از خُلق او باید گرفت!

''جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔ اس کی رحمت عام ہے اور اس کا اخلاق بہت عظیم (بلند) ہے۔ ان کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہئے' ان کے اخلاق سے حصہ حاصل کرنا چاہئے۔''

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے؟ اتنا ہی اس کے ہاں تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاں ہمارا کیا درجہ ہے؟ (کیونکہ مصطفیٰ سے بعد ہی تو بولہبی ہے) تو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبویؐ سے کتنا حصہ پایا ہے؟

حافظ صاحب مرحوم کا یہ مضمون گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے سیرت نمبر (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوا تھا۔

## قارئین توجہ فرمائیں

بعض کرم فرماؤں کو ماہنامہ میثاق' حکمت قرآن اور ہفت روزہ ندائے خلافت کا اجراء یا تجدید بذریعہ VPP کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات ہمارے معزز قارئین خود ہی VPP ارسال کرنے کی فرمائش کرتے اور بعض اوقات ان کے احباب میں سے کسی کی سفارش پر ایسا کیا جاتا ہے۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں کہ جب تک ادارے کو VPP کی رقم موصول نہیں ہو جاتی اس وقت تک پرچے کا باقاعدہ اجراء عمل میں نہیں آتا۔ اس سلسلے میں بعض اوقات 4 سے 6 ہفتے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر قارئین کی جانب سے VPP چھڑا لینے کی اطلاع ہمیں موصول ہو جائے تو (رقم موصول ہونے سے پہلے بھی) پرچے کا اجراء عمل میں لایا جا سکتا ہے۔